بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح خس و خاشاک کی خفیف سے خفیف حرکت کو دیکھ کر ہوا کے رُخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح زندگی کے معمولی واقعات کا مطالعہ و مشاہدہ ہمیں صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ کسی فرد یا قوم کے مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اُس کی زندگی کے غیر معمولی واقعات پر ہی غور کیا جائے بلکہ بسا اوقات حیاتِ انسانی کے غیر اہم گوشے حقیقت کو بے نقاب کرنے میں بہت بڑی مدد دیتے ہیں۔ بلکہ اب تو ماہرینِ نفسیات نے بڑے ٹھوس اور واضح دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اُس کو صحیح طور پر جانچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ صرف اُن افعال و اعمال کے غور و فکر پر صرف کریں جو کسی انسان یا قوم سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوتے ہیں اور جن کے سوتے شعور سے نہیں بلکہ لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبلتے ہیں۔

آپ اگر اس نقطۂ نظر سے قوم اور اس کے اصحابِ اختیار کی حرکات و سکنات اور اُن کی نجی اور بے تکلفانہ گفتگوؤں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حمیت نام ہے جس کا وہ اب پاکستان کی سرزمین میں دم توڑ رہی ہے۔ یہاں سے ہزاروں افراد ہر سال بھارت جاتے ہیں، وہاں کی کلچر فلمیں دیکھتے ہیں اور اُن لوگوں کی مہمان نوازی سے سرفراز ہوتے ہیں جن کے قبضے میں ابھی تک ہماری ملّت کی لاتعداد بیٹیاں نہایت ہی

کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان زندہ در گور لاشوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اُس کے تصور سے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ان بھارت یاترا کرنے والوں کو کبھی اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ہاں عفت و عصمت کی کبھی بڑی قدر تھی اور مظلوم بہن کی ایک چیخ سے ایوانِ حکومت کے در و بام ہل جایا کرتے تھے اور فرمانروا سے لیکر ملت کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد اُس کی دادرسی کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھتا تھا۔ دُور نہ جائیے خود اسی نیم برِاعظم کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ محمد بن قاسم اور اس کے رفقاء کار کو اس سرزمین کی طرف ملت کی چند بیٹیوں کے نالہ و فریاد نے ہی آنے پر مجبور کیا اور انہوں نے اُس وقت تک چین نہ لیا جب تک کہ ظالموں کے پنجۂ استبداد سے انہیں رہائی نہ دلا دی۔ مگر آج خدا جانے ہماری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔

بے حسی ملک کے جس طبقے میں بھی ہو بہر حال کسی ملت کے لیے کوئی نیک فال نہیں ہوتی لیکن برسرِ اقتدار گروہ کی بے حمیتی پوری قوم کو رسوا اور ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہمارے ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ آئے دن جس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کرتا رہتا ہے اُس سے نہ صرف اُس کے صحیح مزاج کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ قومی وقار کو بھی شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ایک مسلمان قوم کے لیے ماہ صیام جس عزت و احترام کا حامل ہے اُسے پوری دنیا جانتی ہے لیکن حکومت کے ایوانوں میں اس مقدس مہینہ کی تقدیس کو جس انداز سے پامال کیا جاتا رہا اُس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی غیر معمولی چھان بین یا تجسس کی ضرورت نہیں آپ صرف اُن خبروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیں جو محکمہ تعلقاتِ عامہ کی چھلنی میں سے چھن چھن کر اخبارات کی زینت بن چکی ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک خبر یہ ہے کہ جب سردار سورن سنگھ بھارتی وفد کے قائد کی

حیثیت سے ہوائی جہاز سے نیچے اُترے تو پاکستان کے وزیر خارجہ نے اُن کی خدمت میں شربت کا ایک گلاس پیش کیا - اس پر سردار صاحب نے برجستہ کہا "میں نے جس ملک کی سرزمین میں قدم رکھا ہے اُس میں آج کل ماہ رمضان کی وجہ سے دن کے وقت کھانا پینا ناجائز ہے - اس لیے یہ مناسب نہیں کہ میں عوام کے جذبات اور احساسات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ جسارت کروں" سردار صاحب کے یہ الفاظ سُن کر بھٹو صاحب کو اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہونا چاہیے تھا لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے پھر بڑے اصرار کے ساتھ اس گلاس کو اُن کی خدمت میں پیش کیا -

---

قومی زندگی میں بظاہر یہ معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے ہمارے ارباب بست و کشاد کی ذہنیت کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے - سردار صاحب کے دل میں اس مبارک مہینے کے لیے کوئی جذبۂ احترام ہو یا نہ، یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اُن کا ایک مسلمان وزیر کو اس امر کی طرف توجہ دلانا کہ اس مہینہ میں انہیں یہ حرکت کسی صورت بھی زیب نہیں دیتی ہمارے قومی کردار پر ایک بھرپور طنز ہے - ایک ایسی طنز جس کی چوٹ کو ممکن ہے بھٹو صاحب اور اُن کے ہم مشربوں نے قطعاً محسوس نہ کیا ہو لیکن اس ملک کے ہر غیرتمند شخص نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے - یہ طنز نہیں تھی بلکہ ایک نشتر تھا جسے ہمارے دل میں چبھو کر ہمارے قومی وقار کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی اور ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب ہم دنیا کی وہ بے حس قوم بن گئے ہیں جس کے اندر کوئی قومی خودداری اور کوئی ملّی امتیاز باقی نہیں رہا -

---

یہ واقعہ ہماری ملّی زندگی کا کوئی ایک واقعہ نہیں بلکہ ہماری حیات اجتماعی اب جس ڈگر پر چلائی جا رہی ہے اُس میں اس قسم کے واقعات معمول کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ہمارے

یاں بڑی بے تکلفی کے ساتھ سرکاری سرپرستی میں کرکٹ میچ اور اسی طرح کے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں کو بڑی آزادی کے ساتھ دعوتیں دی جاتی ہیں اور انکی طرف سے دعوت کا معمولی سے معمولی اشارہ پاکر ہم فوراً بھاگ اٹھتے ہیں جیسے کہ ہم برسوں سے اسی ایک مقصد کیلیے پابہ رکاب تھے۔ ہمارے دماغ اب اتنے ماؤف اور ہمارے احساسات اب اتنے مردہ ہوچکے ہیں کہ ہم یہ سوچ بھی نہیں پاتے کہ ہمارے کوئی دینی شعائر بھی ہیں جن کا ادب واحترام ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔

آپ اگر اس افسوسناک صورتِ حال کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بیماری کی اصل جڑ وہ احساس کمتری ہے جو اس ملک کے مغرب زدہ طبقہ کے اندر برسوں سے پرورش پا رہا ہے۔ اس طبقہ نے مغربی تہذیب و تمدن کی آغوش میں آنکھ کھولی پھر اسی کے سایۂ عاطفت میں وہ پل کر جوان ہوا اُسی کے پیش کردہ افکار و نظریات سے اس نے اپنے فکری سانچے تیار کیے، اسی سے اس نے عادات و اطوار کا درس حاصل کیا الغرض اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں اس نے پوری طرح پورے اخلاص اور اعتماد کے ساتھ اس سے رہنمائی حاصل نہ کی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ معتقدات، احساسات و جذبات اور مزاج کے اعتبار سے بالکل فرنگی ہے اور اسے یہ روش اتنی عزیز ہے کہ وہ ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اس سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس کی اس تہذیب کے ساتھ مخلصانہ وابستگی پر کوئی حرف آتا ہو اور کسی مغربی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ اس میں "رجعت پسندی" کے ابھی کچھ آثار باقی ہیں۔

شعائر دین سے یہ بے توجہی اور مغربی اقدار حیات سے یہ شیفتگی صرف اس لیے ظاہر کی جاتی ہے کہ اُن کے اور ہمارے درمیان "من و تو" کے جو حجابات حائل ہیں وہ سراسر ختم ہوں اور ہم کسی طرح اپنے ان فرنگی آقاؤں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوجائیں کہ یہ تمام امتیازات

جن کے وہ اکثر تذکرے سنتے رہتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ہم سے بُعد اور بیگانگی محسوس کرتے ہیں، یہ صرف چند تنگ نظر اور تاریک خیال لوگوں کے بوسیدہ تصورات ہیں جن کی ہمارے ہاں اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ ہم درحقیقت انہی افکار و اعمال کے پرستار ہیں جو تمہارے اندر رائج ہیں۔ تمہاری تہذیب ہی ہماری تمنّاؤں اور آرزوؤں کی مرکز و محور ہے اور اسی سے روشنی حاصل کر کے ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منوّر کرنا چاہتے ہیں۔ "ہماری اور تمہاری جدائی" کی خبر بالکل بے بنیاد ہے بلکہ یہ ایک ہوائی ہے جسے کسی دشمن نے محض رقابت کے جذبہ میں اڑا دیا ہے۔ تمہیں ایسی خبروں پر قطعاً توجہ نہ دینی چاہیے بلکہ ہمارے ساتھ اس اندازہ سے وابستہ ہونا چاہیے۔

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

گزشتہ دو تین ماہ سے مسئلہ کشمیر پر جس انداز سے اور جس قسم کے حالات کے تحت اینگلو امریکن بلاک کی براہ راست نگرانی میں گفتگو ہو رہی ہے اس پر ملک کا ہر بہی خواہ مضطرب اور پریشان نظر آتا ہے۔ یہ گفتگو نہ صرف ہمارے سیاسی تدبّر کا امتحان ہے بلکہ ہمارے اخلاق کی بھی نہایت ہی کڑی آزمائش ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے رفقاء کار نے گزشتہ پندرہ سالوں میں جس قسم کی بدعہدی کی ہے اور جس اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخ کا ایک نہایت ہی شرمناک باب ہے۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقتدار کے نشے نے ان لوگوں کو اس حد تک دیوانہ بنا دیا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے دوررس اخلاقی نتائج سے یکسر غافل ہو چکے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ قوموں کے عروج و زوال میں صرف فوج اور اسلحہ ہی فیصلہ کن قوت نہیں ہوتی بلکہ اس میں اخلاقی اقدار بھی بڑے مؤثر طریق سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر مادی قوت اور طاقت ہی تعمیر و ترقی کا واحد زینہ ہوتا تو جو قومیں ایک مرتبہ بام عروج پر پہنچ چکی تھیں انہیں

کبھی بھی آسمان پیوندِ خاک نہ کر سکتا لیکن ہمیں تاریخ میں ایسی بے شمار قوموں کے نشانات ملتے ہیں جنہوں نے ایک وقت میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قوت و طاقت حاصل کی۔ دوسری قوموں کو غلام بنایا اور جگہ جگہ اپنی قیادت اور سیادت کے جھنڈے گاڑے لیکن دوسرے مرحلے میں یہی قوت اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی اور تاریخ کے وہ اوراق جن میں اُن کے عظیم الشان کارناموں کے قصّے سنہری حروف سے لکھے جاتے تھے ان کے اندر اُن کے تنزّل اور انحطاط کی عبرتناک داستانیں بھی درج ہوئیں۔

محض طاقت جس کی پشت پر کوئی اخلاقی حس موجود نہ ہو وہ ہمیشہ موت اور بربادی کا پیغام ہوتی ہے اس لیے عقلمند قومیں ان دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی قوم کی اس سے افسوسناک اخلاقی پستی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پہ پورے ملک کی تقسیم کو قبول کرتی ہے لیکن اب کشمیر کے معاملے میں اس نظریہ کو یکسر باطل قرار دے رہی ہے۔ پھر یہی قوم تقسیم ملک کے بعد بہت سی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کو یہ کہہ کر ہڑپ کر جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اصل فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہے، ان ریاستوں کے باشندگان کی اکثریت چونکہ غیر مسلم ہے اس لیے انہیں لازمی طور پر ہندوستان کے ساتھ ہی وابستہ ہونا چاہیے۔ اسی اصول کے تحت منگرول، مناودر، جوناگڑھ حیدرآباد اور گوا پر دستِ ظلم دراز کیا گیا لیکن کشمیر کے معاملے میں چونکہ یہ اصول اُس کے مفاد کے خلاف پڑتا ہے اس لیے اسے غلام رکھنے کیلئے یہ کہا جاتا ہے کہ والئ ریاست نے اس بدنصیب خطّہ کے رہنے والوں کی قسمت چونکہ ہمارے ہاتھ میں سونپ دی ہے اس لیے اس پر ہمیں پورے پورے حقوقِ مالکانہ حاصل ہیں۔

یہی نہیں بلکہ آغاز میں جب اس خطّہ کو اپنی تحویل میں لیا گیا تو پوری دنیا کی آنکھوں میں خاک

جھونکنے کے لیے اس بات کا بار بار اعلان کیا جاتا رہا کہ ہم اس ریاست کے بارے میں کوئی جارحانہ عزائم نہیں رکھتے بلکہ صرف اس بات کے آرزومند ہیں کہ اس پس ماندہ خطہ کے رہنے والے بغیر کسی جبر و اکراہ کے بالکل آزادی کے ساتھ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ ملک گیری ہمارا مقصد نہیں ہم عارضی طور پر اس ریاست کا انتظام و انصرام سنبھال رہے ہیں تاکہ ہم وہ حالات پیدا کر سکیں جن کے تحت اس مقدس مقصد کی تکمیل جلد ممکن ہو۔ اسی سلسلہ میں یو۔ این۔ او میں ایک قرارداد بھی پاس کی گئی۔ لیکن چونکہ نیت کے اندر اوّل روز ہی سے فساد موجود تھا اس لیے ایک طرف تو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس استصواب کو مسلسل ٹالا گیا اور دوسری طرف ایسی شرمناک تدابیر اختیار کی گئیں جن سے کشمیر کے بے بس عوام پر بھارت کا تسلط مضبوط ہوتا چلا گیا ——

—— کشمیر کے حقیقی رہنما اور آزادیٔ وطن کے جاں نثار جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے ان پر جھوٹے مقدمے قائم ہوئے، ان پر غداری اور وطن دشمنی کے بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے اور اس طرح کشمیر کے ان خیر خواہوں کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں پہنچا کر انہیں راستے سے ہٹانے کی مذموم کوششیں کی گئیں اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو قوت اور طاقت کے بل بوتے پر عوام کی گردنوں پر مسلط کر دیا گیا جنہیں کشمیری عوام کے مفاد کی جگہ اپنا ذاتی مفاد زیادہ عزیز تھا اس لیے ان بے ضمیر لوگوں نے ریاست کے مستقبل کے متعلق سوچنے کی بجائے بھارت کے مفادات کی حفاظت و پاسبانی کرنا اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا۔ ان لوگوں کی حیثیت بعض کرائے کے سپاہیوں کی سی تھی جنہیں اُن کا آقا جس طرح چاہتا بے دریغ استعمال کرتا۔

پھر توپوں کی گرج اور سنگینوں کے سائے میں ایک اسمبلی کے انتخاب کا ڈرامہ کھیلا گیا اور مختلف قسم کی چالبازیوں سے کام لیکر اہلِ دنیا کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ اسمبلی ہی اہلِ ریاست کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کی صحیح معنوں میں نمائندہ اور ترجمان ہے اور چونکہ اس نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا استصواب کی اب قطعاً ضرورت باقی نہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور اُن کے رفقاء کار نے کشمیر کے معاملے میں جس قسم کی بد عہدی، چالاکی اور عیاری اور جس نوعیت کے ظلم و استبداد سے کام لیا ہے، اُس پر انسانیت جس قدر بھی ماتم کرے اتنا ہی کم ہے۔ لیکن ہمیں بھارت کے سربراہوں سے کہیں زیادہ افسوس امن کے مغربی علمبرداروں پر ہے جو مظلوموں کی دادرسی کے دعویدار ہیں۔ ان لوگوں نے مکر و فریب کے اس سارے کاروبار کو جس طرح غیر متعلق تماشائی بن کر دیکھا ہے اور جس بے حسی کے ساتھ اسے برداشت کیا ہے بلکہ اس کی طرفداری اور حمایت کی ہے وہ انسانیت کی پیشانی پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے شاید کبھی مٹایا نہ جا سکے۔

ہندوستان پر ہمارا غیظ و غضب بجا، لیکن ہمیں ذرا خود بھی اپنے اعمال کا جائزہ لیکر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے کشمیر کے معاملے میں کس حد تک سیاسی تدبر اور دانشمندی اور اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

کشمیر کے بارے میں ہم سے بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہیں جن کا ذکر شاید سخت تلخ ہو۔ اس لیے ہم اس داستان کو دہرانا نہیں چاہتے لیکن دو تین باتیں ہم قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ ایک یہ ہم نے اس مسئلہ سے پوری دنیا کو آشنا کرنے کے لیے اتنی کوشش نہیں کی جس کا یہ فی الواقع مستحق ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی لیکن ہم نے اس معاملہ میں افسوسناک تساہل سے کام لیا ہے۔ اگر دنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں اپنے نہایت معمولی مسائل کے لیے پوری دنیا کے اندر ہلچل پیدا کر سکتی ہیں اور ساری انسانیت کو اُن کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس معاملہ میں ناکام ہوتے لیکن ہماری سہل پسندی اور بے تدبیری کی وجہ سے اور خاص طور پر ہماری وزارتِ خارجہ کی عدم توجہی کی بنا پر ہم مسئلہ کشمیر سے دنیا کی قوموں کو پوری طرح روشناس نہیں کرا سکے۔ اگر اس کام کو پوری دلسوزی اور ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیا جاتا تو ہمیں یقین ہے کہ ہم اس مسئلہ پر اپنے

بہت سے حامی پیدا کر لیتے۔ خصوصاً مسلم ممالک کی کثیر تعداد ہماری تائید پر آمادہ ہو جاتی، اور ہم آج اپنے آپ کو اس طرح تنہا اور بے بس محسوس نہ کرتے جس طرح کہ فی الحقیقت کر رہے ہیں ۔

دوسرے ہم نے اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے اینگلو امریکن بلاک پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ہم گزشتہ پندرہ سالوں میں یہی سمجھتے رہے ہیں کہ امریکہ اور انگلستان ہمارے سچے خیر خواہ ہیں وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے بھارت کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ کشمیر میں استصواب کرائے اور پھر اس کے نتیجے پر ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ دوسروں پر اعتماد یقیناً بہت بڑی خوبی ہے لیکن ہم نے اپنے ان مغربی دوستوں کے بارے میں جس قسم کے حسنِ ظن سے کام لیا ہے اسے اگر ابلہ فریبی کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ یو این۔ او کے اجتماعات میں روس کھل کر ہندوستان کے موقف کی حمایت کرتا رہا لیکن ہمارے ان حامیوں نے ایک مرتبہ بھی غیر مبہم الفاظ میں ہماری تائید نہیں کی بلکہ انہیں جب کبھی بھی اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کا موقع ملا تو یہی کہا کہ یہ بھارت اور پاکستان کا ذاتی مسئلہ ہے ہم اس میں دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہر قدم پر ہمارے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ دوستی بڑھانے کے لیے مختلف قسم کی چالیں چلتے رہے۔ انہوں نے کسی ایک مرحلہ پر بھی اپنی رفاقت کا حق ادا نہ کیا لیکن ہماری سادہ لوحی بلکہ حماقت دیکھیے کہ دجل و فریب کی یہ ساری کارروائیاں دیکھنے کے باوجود اُن پر ہمارا اعتماد قطعاً متزلزل نہیں ہوا، ہمیں آج بھی اُن کے عہد و پیمان پر پورا پورا بھروسہ ہے، وہ آج بھی ہماری امیدوں کے مرکز و محور ہیں۔ اور ہمارے مفادات کے واحد محافظ اور نگراں۔ ہم بار بار کی چوٹیں سہنے کے باوجود ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ بلاک ہی ہمارا نجات دہندہ ہے اور اس سے منہ موڑ کر ہم دنیا میں ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

ہماری ان خوش فہمیوں بلکہ ابلہ فریبیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کی رضا جوئی کے لیے

دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دیا ہے۔ بہت سی وہ قومیں جن کے ساتھ ہمارے دینی روابط ہیں اور جن کی مدد پر ہم بجا طور پر اعتماد کر سکتے ہیں انہیں ہم نے اپنی اس غلط روش کی وجہ سے ناراض کر لیا ہے، وہ ہمیں اینگلو امریکن بلاک کا ایک بے بس غلام سمجھتی ہیں، اُن کے نزدیک ہماری اپنی کوئی رائے اور کوئی آزاد پالیسی نہیں، ہم اس استعماری ٹولے کے ہاتھ میں بس ایک کٹھ پتلی ہیں جسے وہ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے، نچواتا چلا جاتا ہے۔

اس رائے میں غلط فہمی اور مبالغہ آمیزی کے اجزا تو شامل ہو سکتے ہیں لیکن اس افسوسناک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری قومیں اگر ہمارے بارے میں اس قسم کے غلط تصورات رکھتی ہیں تو اُن کے لیے ہمارے طرزِ عمل نے ایک بنیاد بالضرور فراہم کی ہے۔ اُن کی اس غلط فہمی کو سراسر بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت اگرچہ بڑی تلخ ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے آج تک کسی ایک معاملے میں بھی اینگلو امریکن بلاک کے منشا کے علی الرغم کوئی پالیسی اختیار نہیں کی۔ اس بلاک کی فریب کاری سے جب ہم پر کوئی نئی افتاد آتی ہے تو ہم وقتی طور پر کچھ برہمی کا اظہار کر لیتے ہیں لیکن ہماری اس غلامانہ روش میں قطعاً کوئی فرق نہیں آتا۔

اس غلط پالیسی کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو ایک خاص حلقے کے اندر محدود کر لیا ہے۔ اس حلقے سے باہر ہمارے نزدیک کوئی قوم موجود ہی نہیں، اس لیے اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنا، اس کی اخلاقی تائید حاصل کرنا یا اُس سے تجارتی روابط قائم کرنا، ہمارے لیے سرے سے خارج از بحث ہے۔ ہم ایک گھڑے کی مچھلی بن کر رہ گئے ہیں، اس لیے باہر کی دنیا سے ہمارا اب کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ ہماری اس غلط پالیسی سے ہمیں جتنا نقصان پہنچا ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بین الاقوامی معاملات پر کچھ نظر رکھتے ہیں۔ ہندوستان بھی ہمارے ساتھ آزاد ہوا ہے لیکن چونکہ اُس نے اپنی خارجہ پالیسی کو کسی بلاک کے ساتھ وابستہ نہیں کیا، اس لیے

وہ دنیا کی ہر قوم سے بڑی آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ اُس نے روسی بلاک سے بھی بوقتِ ضرورت بھرپور امداد حاصل کی اور اینگلو امریکن بلاک سے بھی جس طرح چاہا فائدہ اٹھایا۔ اُس کی اس آزاد روش کی وجہ سے بسا اوقات اسے ایسی قوموں کی تائید اور حمایت حاصل ہوئی جن کی حیثیت ہمارے اپنے بھائی بندوں کی سی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اینگلو امریکن بلاک کی معاشی امداد جس کے احسان کے نیچے ہم اپنے آپ کو اس قدر دبا ہوا پاتے ہیں وہ بھی ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ جس کے ذریعے سے ہمارے ملک کے اندر امریکہ اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ آخر ہندوستان بھی تو یہ امداد ہم سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر وصول کرتا رہا ہے لیکن اُس نے اس امداد کو اپنی خارجہ پالیسی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اگر یہ امداد ہماری معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہے تو پھر ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے لیکن اگر یہ ہماری آزادی کا سودا ہے، اگر اس کی صورت ٹرائے کے اس لکڑی کے گھوڑے کی سی ہے، جس کے اندر چھپ کر استعمار ہمارے ملک کے اندر گھسنے کے ناپاک عزائم رکھتا ہے، تو پھر ہم ہزار لعنت بھیجتے ہیں اس امداد پر، اور اُن لوگوں پر جو ہماری اعانت اور دستگیری کی آڑ میں ہم پر غلامی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ امداد خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اور اُس کے نتائج ہمارے ملک کے لیے کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں وہ کبھی بھی ہماری آزادی کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم کے لیے اُس کی آزادی اور خود مختاری اُسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

اگر لنکا جیسی کمزور مملکت غیر ملکی امداد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے دنیا میں زندہ رہ کر ترقی کر سکتی ہے تو آخر ہم اس امداد کے بند ہو جانے کے خطرے سے کیوں اتنے ہراساں ہیں۔ سیلون کی حکومت نے تیل کی کمپنیوں کو جب قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کیا تو امریکی مالکان

سخت تلملاتے اور اپنی حکومت کو سیلون کی امداد بند کرنے پر مجبور کر دیا لیکن اُس نے اس دباؤ کو پرِکاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور اس معاملے میں جس حیرت انگیز جرأت اور خودداری کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے گا ۔ مسز بندرانائیکے نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ غیر ملکی امداد کوئی ایسی ناگزیر چیز نہیں جس پر کسی ملک کے فنا و بقا کا دار و مدار ہو۔ اس امداد کی کمی کو فہم و فراست، حسنِ تدبر، اور جوشِ عمل سے بآسانی پورا کیا جا سکتا ہے اگر کوئی قوم دوسری اقوام کی دست نگر ہونے کی بجائے خودداری کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا عزم کر لے تو کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ قوم کا اجتماعی اخلاق، اس کے مختلف طبقوں کے درمیان اتفاق و اتحاد، اُس کا غیر معمولی اخلاص اور ایثار، اُس کے اندر آگے بڑھنے کا سچا ولولہ، مادی وسائل کے خلا کو بآسانی پُر کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ راہ بڑی کٹھن اور دشوار ہے اور افکار و نظریات، اور جذبات و احساسات کی صحت مندانہ تربیت مادی وسائل کی ترقی سے کہیں زیادہ صبر آزما ہوتی ہے اور اس بنا پر بہت سی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کرنا پڑتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر ملک کو ایسے وسائل سے ضرور نوازا ہے کہ اس کے رہنے والے اگر چاہیں تو محنت اور اخلاص سے اپنی بنیادی ضروریات ان کے ذریعے سے بآسانی فراہم کر سکیں۔ خالقِ کائنات کا یہ نظام اشتراک اور تعاون کی طرف تو رہنمائی کرتا ہے اور اس کی ترتیب اس حقیقت کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ قوموں کے درمیان تعصبات کی جو مصنوعی دیواریں حائل ہیں وہ منہدم ہو جائیں، اُن کے مابین ربط و ضبط بڑھے اور مختلف خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے کے دمساز و رفیق بن کر رہیں، لیکن قدرت کے اس حکیمانہ نظام میں اس بات کا بھی پورا پورا اہتمام موجود ہے کہ کوئی قوم محض قدرتی وسائل کے بل بوتے پر دوسری اقوام کو غلام نہ بنا سکے اور اسی طرح کوئی قوم صرف مادّی وسائل کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ پائے۔

جس طرح انسانوں کے درمیان صلاحیتوں کی کمی بیشی ہوتی ہے بالکل اسی طرح مختلف قوموں کے مادّی وسائل کے درمیان بھی تھوڑا بہت تفاوت ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ تفاوت ایسا نہیں جس کی بنا پر اُن کی تقدیر متعین ہو۔ مادی اسباب بلاشبہ قومی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن انسان کی فکری اور اخلاقی قوتیں ان اسباب سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ان قوتوں کے ذریعے انسان نے مادی اسباب کی کمی کو بطریقِ احسن پورا کیا ہے اور دنیا میں وہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے ہیں جو انسانیت کے لیے آج بھی سرمایۂ افتخار ہیں۔

ہم یہ بات کسی جذباتیت کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کی بنا پر کہتے ہیں کہ آج اگر امریکہ ان قرضوں کو بند کر دے تو دنیا کی دوسری بیشمار قومیں ہماری طرف دست تعاون بڑھانے کے لیے تیار ہونگی۔ بین الاقوامی سیاست اس وقت جس نہج پر چل رہی ہے اُس میں ایک لمحہ کے لیے بھی خلا پیدا نہیں ہو سکتا، اور جب بھی ایسی صورتِ حال درپیش ہو تو دوسری بیدار مغز قومیں فوراً آگے بڑھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ سے ترکِ تعلق کے بعد دوسری قومیں لازمی طور پر ہم سے مُنہ موڑ لیں گی اور ہم دنیا میں بے سہارا بن کر رہ جائیں گے۔ سیلون کے معاملے کو ہی دیکھیے، برطانیہ نے بھی اپنے "پیرو مرشد" امریکہ کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور امداد بند کرنے کی بجائے سیلون سے صرف اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسے اُس کی سرمایہ کاری کا مناسب معاوضہ ادا کر دے۔

اگر بالفرض ایک لمحہ کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امریکہ کے روٹھ جانے سے ہم پر غیر ملکی امداد کے دروازے ہر طرف سے بالکل بند ہو جائیں گے تو پھر بھی انشاء اللہ ہماری حیاتِ اجتماعی کو کسی

قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ اُس صورت میں ہماری معاشی ترقی کی رفتار اگرچہ قدرے سُست پڑ جائے گی لیکن ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور ہم آزادی کے ساتھ اپنی خارجہ پالیسی طے کر سکیں گے۔ اینگلو امریکن بلاک سے باہر جو قومیں بھی ہیں اُن کا ہمارے معاملے میں طرزِ عمل کافی حد تک تبدیل ہو جائے گا اور اس طرح ہم اپنی دنیا خود آباد کرنے میں کامیاب ہونگے۔ ہم اپنے مخصوص نظریات، حالات اور ضروریات کے تحت اپنے معاشی منصوبے بنائیں گے اور ہماری دولت کا وہ حصّہ جو عیاشیوں پر خرچ ہو رہا ہے وہ کسی مفید کام میں صرف ہوگا۔ دولت کی کمی سے قوم کو بحیثیت مجموعی کبھی نقصان نہیں پہنچتا۔ صرف چند افراد کو جو نہایت اونچے معیارِ زندگی کے عادی ہوتے ہیں انہیں البتہ تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن ان کی معمولی تکلیف سے اگر پوری قوم کی آزادی برقرار رہے تو اسے کسی لحاظ سے بھی خسارے کا سودا نہیں کہا جا سکتا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ کئی ایک ملکوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مغربی امداد کے بغیر بھی اقتصادی اور علمی ترقی ممکن ہے۔ کیا روس کا نظام مغرب کی دشمنی کے باوجود پروان نہیں چڑھا۔

پھر اس ضمن میں اس کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ غیر ملکی امداد کو پس ماندہ ممالک میں جس طریق سے استعمال کیا جا رہا ہے وہ بھی بڑا افسوسناک ہے اور اس کے نتائج انتہائی حوصلہ شکن ہیں۔ اس امداد سے ملک خوشحال ہونے کی بجائے قرضوں کی جکڑ بندیوں میں مسلسل جکڑتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ روز بروز مغربی قوموں کا دست نگر اور محتاج بننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس امداد کا معتدبہ حصہ "غیر ملکی ماہرین فن" ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ملک کے مخصوص معاشی حالات اور اُس کے تقاضوں سے کوئی گہری واقفیت نہیں رکھتے بس یونہی محض سیر و تفریح کی غرض سے، اور اس ملک کے رہنے والوں کے اندر مغربی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے لیے کچھ نیم تربیت یافتہ لوگوں کی فوج ظفر موج پسماندہ ممالک میں دھکیل

دی جاتی ہے اور وہ وہاں جا کر ایسے معاشی منصوبے تیار کرتی ہے جن کا وہ ملک کسی لحاظ سے متحمل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ معاشی منصوبے جلد ہی ایسے مورچوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی حفاظت و پاسبانی سے ہم خود عاجز ہوتے ہیں اور انہیں غیروں کے سپرد کرنے پر اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں۔ یہ غیر ملکی فوج وہاں بیٹھ کر ہمارے ملک کے معاشی استحکام کے متعلق تدابیر اختیار کرنے کی بجائے اُسے سیاسی اعتبار سے بے بس بنانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی ہے۔ ان منصوبوں پر اس انداز سے کام شروع کیا جاتا ہے کہ ہم ہر قدم پر امریکہ اور انگلستان کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور رہیں۔

جو لوگ اس ملک کے معاشی حالات اور ان منصوبوں کی رفتار ترقی پر اور اُن سے متوقع نتائج پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ منصوبے درحقیقت استعمار کے اڈے ہیں اور ان کی تکمیل ہونے تک، ملک کو معاشی لحاظ سے تو شاید تھوڑا سا فائدہ حاصل ہو جائے لیکن ملک پر قرضوں کا اس قدر زیادہ بار پڑ جائے گا جن کی ادائیگی قریب قریب ناممکن ہوگی اور اس طرح اس ملک کی آزادی ہمیں ان قرضوں کے عوض رہن رکھنی پڑے گی۔

پہلے پانچ سالہ معاشی منصوبے کے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں وہ انتہائی حوصلہ شکن ہیں اور ہمارے ان خدشات کو تقویت دیتے ہیں۔ اس منصوبہ میں اس بات کا خاص طور پر التزام کیا گیا کہ ہمارا ملک صنعتی اعتبار سے ترقی نہ کرنے پائے اور ہماری زیادہ تر توجہ زراعت پر ہی مرکوز رہے تاکہ ہم امریکہ اور انگلستان کے کارخانوں کو حسب معمول نہایت سستے داموں خام مال مہیا کرتے رہیں۔ ملک میں ایک طرف صنعتی پیداوار کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا مگر زرعی پیداوار کی قیمت جوں کی توں قائم رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی زرعی پیداوار کو خود اپنے ہاں استعمال نہ کر سکنے کی وجہ سے مغربی قوموں کے ہاتھ بیچنے پر مجبور رہے اور دوسری طرف مغرب سے ہم ایسا تیار شدہ مال خریدتے رہے جسے ہم تھوڑی سی توجہ کے ساتھ خود اپنے

ہاں آسانی کے ساتھ تیار کر سکتے تھے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے ماحصل پر ایک نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ محنت اور سرمایہ کے صرف کے باوجود قومی دولت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا بلکہ افراد کی اوسط آمدنی میں کمی واقع ہوئی ہے، اسی طرح زمین کی فی ایکڑ پیداوار بھی کسی حد تک گر گئی ہے لیکن ہم پر قرضوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔

ان افسوسناک نتائج کی اصل وجہ یہ ہے کہ مغربی قومیں غیر ملکی سرمایہ کے دباؤ کے تحت ہمیں اپنی محنت اور ملکی وسائل کو ایسے منصوبوں پر صرف کرنے کے لیے مجبور کرتی ہیں جو فی الواقع ہمارے لیے معاشی اعتبار سے کچھ زیادہ مفید اور کارآمد نہیں ہوتے اور ہماری قوم ان کے بوجھ کو برداشت کرنے کی پوری پوری ہمت اور طاقت نہیں رکھتی۔ یہ ہے وہ طریق جس سے معاشی امداد کے مقدس نام پر ہمیں دھوکہ دیا جا رہا ہے اور ہم پر اپنی ہی زمین ساری وسعتوں کے باوجود روز بروز تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ امداد بظاہر تعاون اور ہمدردی کا اظہار ہے لیکن حقیقت میں یہ مکر و فریب کا جال ہے جس میں ہمیں پھنسانا مقصود ہے۔ مغربی قومیں آج ان قرضوں سے وہی کام لینا چاہتی ہیں جو استعمار گزشتہ ایک صدی سے مسیحی شفاخانوں اور سکولوں سے لے رہا ہے۔

مغربی قوموں کی چالیں بڑی گہری ہیں اور وہ ہر محاذ پر امتِ مسلمہ کو شکست دینے کے درپے ہیں کیونکہ اس کی بیداری میں وہ اپنی موت دیکھتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس ملت کو برباد کرنے کے لیے بڑے ہی وسیع اور ہمہ گیر منصوبے تیار کیے ہیں۔ مغربی افکار و نظریات کے اثر و نفوذ سے وہ اس قوم کی نوخیز نسلوں میں فکری اور ذہنی انتشار پیدا کر رہی ہیں۔ ثقافت اور کلچر کے نام پر اس کے اخلاق کو تباہ و برباد کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ عیسائی مشنریوں کی وساطت سے اس کے دین و ایمان کو لوٹنے کی کوششیں جاری ہیں اور اب قرضوں کے عوض اس کی آزادی اور خودداری کا سودا کیا جا رہا ہے۔

وہ دن امتِ مسلمہ کے لیے بڑا مبارک ہوگا جب وہ مغرب کے بچھائے ہوئے دامِ ہمرنگِ زمین کو دیکھنے میں کامیاب ہوگی اور اس طرح اس کی چالبازیوں اور عیاریوں کا پردہ چاک کرکے وہ اپنے اندر اس کے اصل عزائم کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے گی۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے کہ ہم میں صحیح بصیرت پیدا ہو اور ہم مغربی قوموں کا غلام بننے کی بجائے خداوند تعالیٰ کی غلامی اختیار کرکے دوسری ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرسکیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی عظیم تالیف تفہیم القرآن کا ایک حصہ

سورۃ المائدہ

- مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی سے متعلق احکامات
- حج کے آداب، شعائر اللہ کے احترام، حرام و حلال کے قطعی حدود، وضو، غسل اور تیمم کے قاعدے، بغاوت، فساد اور سرقہ کے حدود و تعزیرات کی توضیح
- شراب اور جوئے کی حرمت، قسم توڑنے کا کفارہ اور قانونِ شہادت۔
- عدلِ اسلامی، پابندیٔ عہد اور اہلِ کتاب کی گمراہیوں سے اجتناب کی تلقین۔

طلباء اسلامیات کے لیے ایک نادر تحفہ

مدلل تشریح و تعبیر کا ایک جامع مرقع

ہدیہ قسم اول مجلد ولایتی کاغذ ۳/۵۰ روپے

" قسم عام ۲/۲۵ روپے

محصول ڈاک ۵۰ پیسے

ناشر: مکتبہ تعمیرِ انسانیت موچی دروازہ - لاہور